

مولانا ابوالکلام آزاد

بحیثیت ایک صاحب طرز انشا پرداز کے

از جناب رفیع انور صاحب ایم اے

(۲)

مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں

”خود صحبت آزمایاں شبینہ کا بیان ہے کہ یہ بارہ گساری رات کے دو بجے تک جاری رہی تھی۔ اللہ! اللہ! جاڑے کی راتیں اور پچھلے پہر کی ”پراسرار“ صحبتیں!!! آپ الزامِ اعتراض کی فکر میں ہیں اور رات کے دو بجے کے لفظ سے نہیں معلوم کیسے کیسے خیالات میرے دل میں گزر رہے ہیں۔ رات کی تاریکی، پچھلا پہر، زندانِ شاعر کہنے کا هجوم اور بعض نوجوان و نوا موزمیدیانِ حریت اور پھر شغلِ مے پرستی کا یہ عالم! اب کیا کہوں کہ کیا کہنا چاہتا ہوں؟“ (از حدیث الغاشیہ)

پھر:-

چند دل کے ٹکڑے ہیں جن کو صفوں پر بچھانا چاہتا ہوں۔ کیونکر بچھاؤں؟ چند آنسو ہیں جن کو کاغذ پر پھیلانا چاہتا ہوں کیونکر پھیلاؤں؟ آہ! ان لفظوں کو کہاں سے الاول جودلوں میں ناسور سید کر دیں۔ آہ! اپنے دل کے زخموں کو کیونکر دکھاؤں کہ اوروں کے دل بھی زخمی ہو جائیں۔ موت دونوں کو آتی ہے۔ سپاہی کو میدانِ جنگ میں اور مجرم کو سولی کے تختے پر۔ پہلی وہ عزت کی موت ہے جس پر ذلت کی ہزاروں زندگیاں قربان اور دوسری وہ

ذلت کی موت ہے جس کے بعد انسانی روح کے لئے اور کوئی ذلت نہیں اگر یوں نے
ہم سے آخری انتقام لینے کا فیصلہ کر لیا ہے تو کاش ہمارے سینے میں گولی لگتی۔ ہمارے
گلے میں پھندا نہ ڈالا جاتا۔

کس قدر سلیس اور سہل الفاظ ہیں مگر کس قدر معنی خیز اور موثر لفظوں اور فقرہوں میں دل کے
ٹکڑے اور سینے کے داغ جیسے ہوئے ہیں، ان کی تحریر ایک سنگتی ہوئی آگ، بجھتا ہوا شعلہ، امڈتا ہوا
سیلاب اور کڑکتی ہوئی بجلی ہے کہیں کہیں آہیں اور نلکے بھی ہیں۔ بلکہ یقین اور ایمان کی نختی قدم قدم
پر نظر آ رہی ہے۔ مثلاً:-

’صداقت کی مظلومی کوئی نیا واقعہ نہیں۔ اس پر ابتلا و آزمائش کے ایسے ایسے ہلاکت
آفریں وقت آئے ہیں۔ جب خدا کی زمین پر چند دلوں کے سوا اس کا کہیں نشین نہ تھا لیکن بلوچ
اس کے سچ رہا اور باطل باطل، حق کی قوت کا استحکام سترزل نہیں ہو سکتا۔ وغیرہ وغیرہ۔

وہ اس چیز کے خلاف ہیں کہ غم و اندوہ اور ناکامیاں ہماری جدوجہد کو بند کر دیں۔ وہ غم انگیز
موضوعات پر بھی گفتگو کرتے ہیں۔ لیکن عبرت و بصیرت کے حصول اور آئندہ کو روشن بنانے کے لئے انھوں نے
ترکی شہیدوں کی لاشوں پر خوتا بہ فثانی کی ہے۔ کانپور کے خونی ہنگامہ پر ہم عزاکو ترتیب دیا ہے۔ شہداء
طرابلس کی یادیں خون کے آنسو بہائے ہیں۔ خود اپنے جسم و جان کو قید و بند کی صعوبتوں اور رنج و الم
کی مصیبتوں میں گرفتار کر لیا ہے۔ لیکن بایں ہمہ یاس کا سایہ کبھی ان کی تحریر پر نہیں پڑتا۔ ان کے نزدیک
زندگی عیش و نشاط کا نہیں بلکہ ڈوب ڈوب کر ابھرنے اور قدم قدم پر نکھو کر لگنے، چلنے اور گر پڑنے
لیکن پھر سنبھلنے اور سب کو سنبھال لینے کا نام ہے۔ وہ ہر خونچکاں کفن اور ہر مجروح سینہ کی زبانی نصرت
کا مرانی اور فوز و فلاح کا پیغام سناتے ہیں۔ رنج و الم اور خونی ماحول کے مقدمے بہترین طریقے پر ترتیب
دے کر فتح و مراد کا نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔ تاکہ قوم میں حرکت و عمل پیدا ہو۔ وہ رلاتے ہی نہیں بلکہ بے پناہ

طریقے تربیت میں تاکہ ہنسیا جاسکے۔

مقصود باز دیر و حرم جز جیب نیست ہر جا کنیم سجدہ ہر آستان رسد
اسی چیز سے متاثر ہو کر رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم نے فرمایا تھا کہ میں نے بیڈری ابوالکلام
کی نثر اور اقبال کی شاعری سے سیکھی۔

مولانا آزاد کی بعض تحریروں میں طنز بھی پائی جاتی ہے اور ان کا نشانہ طنز 'جدیریت' علم و
دانش کا زعم باطل اور افرنگیت ہوتے ہیں۔ ان کی طنز کا انداز نمایاں طور پر سر پرستانہ اور بے پروایانہ ہوتا ہے
ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ دنیا بھر کو پائے استحقاق سے ٹھکرا رہے ہوں اور ہر شے پر پوچھ ہو کر رہ گئی ہو۔
ان کی طنز میں ایک جبروتی شان ہوتی ہے۔ ان کے یہاں خطیبانہ جوش اور ہیجان طغیانی ہے اور انھوں نے
اپنی طنزیات میں خطابت کو بہترین طریقہ سے سمویا ہے۔ ان کی طنز کے ایک ایک فقرہ اور خیال میں قوت
اور بیداری کے آثار پائے جاتے ہیں۔ وہ بددعاؤں اور عذاب الیم کی بشارتوں سے نہیں ڈرتے بلکہ ان کا
یہاں ایک اعتبار تسلیم و مظاہرہ ہوتا ہے۔ یہاں شدت استہزار تو ہو سکتی ہے لیکن زیر ناک کی کاگز نہیں۔ ملاحظہ ہو
'دیشک مدتوں کے بعد بند ٹوٹے، جس کو کفر کہا تھا اس کے ثواب و طاعت ہونے کا فتویٰ دینا پڑا لیکن کنوڑ
اپنی قوت سے، اپنے دلغ سے، اپنی ہستی اور اپنی روح سے، یہ نہیں بلکہ

آں ہم بسی غمزدہ مردم شکار دوست

پہلے جن کے حکم سے گناہی کے غاروں میں چھپے تھے انہی کے حکم سے باہر نکلے تاکہ مندر میں جا کر
ان کے آگے سر بسجود ہوں۔ بے شک شملہ ڈیپوٹیشن کے تماشے کے بعد ان کا آخری پارٹ کھیلا گیا اور اس
کا نام لیگ رکھا گیا۔ لیکن اگر تم ایک برف خانہ بنا کر اس کا نام آتشکدہ رکھ دو گے تو کیا برف کی بل آگ کا
انگڑا ہو جائے گی۔ اگر ایک کھلونے کا پتلا لیکر اس کے سینے کے پاس کی کل کو انگوٹھے سے دباؤ گے تاکہ
اپنے ہاتھ ہلا کر تالی بجائے تو کیا اس تماشے سے وہ انسان کا بچہ سمجھ لیا جائے گا۔

ہندو مسلم سوال بھی ایک بازیگر کا کھیل ہے اور بد بختی سے مانچنے والے ناچ رہے ہیں، فوج میں پھوٹ پڑ گئی ہے اور غنیم مطمئن ہے۔ یہ خیال کہ تم نے ابھی تعلیم میں ترقی نہیں کی اس لئے تمہارا پالیٹکس یہی ہے کہ پہلے ہندوؤں سے اپنے غصب کردہ حقوق چھین لو۔ غور کرو کہ حریف شاطر کی چال کس قیامت کی ہے صر وہ رہزن اور پھر ایسے ملکین سے

کیا وہ بتلا سکتے ہیں کہ جس جماعت نے مخالفت میں حصہ لیا، ان میں وہ کون لوگ ہیں جن کو سیاست فہمی اور قوم پرستی کا یہ خلعت عطا ہو رہا ہے؟ . . . کیا وہ مسکین جو اپنے پیشواؤں کے شور و غل پر اپنی آموختہ کو دہرا دیتے تھے؟ اگر وہ نہیں تو پھر کیا علی خاں المعروف عبدالرؤف ہے جس غریب کو یہ بھی معلوم نہیں کہ کانگریس کیا بلا ہے اور لیگ کس جانور کا نام ہے اگر وہ نہیں تو پھر کیا مہسئی کے بد معاشوں کا وہ سردار جو اسٹیج کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا تھا اور جو اپنے سیاسی اختلافات کو اس ماہرانہ جملے میں ادا کرتا تھا کہ میرا ملک کا بل کیوں ہندوں کو بخش رہے ہو؟ اگر وہ صرف مزدور تھے اور سیاست کا معلم اول وہی تھا۔ جس کے ذریعہ انھوں نے مزدوری پائی تو کیا سلیمان قاسم مٹھا کے روپوں کی تھیلیوں میں اس سیاسی مہم و تدبیر کو ڈھونڈیں حالانکہ روپیہ سے آلو اور مہسئی کے بد معاش دونوں چیزیں خریدی جاسکتی ہیں مگر نہ تو عقل خریدی جاسکتی ہے اور نہ علم؟

طنز کی بہترین مثالیں ان کے مضامین ”حدیث الغاشیہ“ اور مولوی عبد الماجد سے خط و کرب ولذت والہم کی بحث میں بکثرت ملتی ہیں اور میں بخوف طوالت ان کو نظر انداز کرتا ہوں۔

اور پھر ان سب چیزوں کے علاوہ جا بجا اردو، عربی، فارسی اشعار کا استعمال اس برجستگی سے کرتے ہیں کہ خود شعر کی اہمیت پہلے سے بڑھ جاتی ہے اور اگر اسے غلو و اغراق سے تعبیر نہ کیا جائے تو مجھے یہ کہنے میں مطلق باک نہیں کہ کسی شاعر کا شعر استعمال کر کے اس پر احسان کرتے ہیں۔ وہ شعر نہیں کہتے لیکن شہوت کی روح کو سمجھتے ہیں۔ معلوم نہیں کتنے تیر و شتر مولانا کے حافظہ میں محفوظ ہیں کہ لکھتے وقت

ایک ایک دودھو سطروں کے بعد مختلف اشعار کو نگینوں کی طرح جوڑتے چلے جاتے ہیں۔ اسی طرح اسلامی مسائل کے متعلق جگہ جگہ قرآن و سنت سے استدلال کرتے جاتے ہیں۔ اور اس بے پناہ طرزِ استدلال کے موجب بھی وہ خود ہی ہیں۔ ان سے متاثر ہو کر بہتوں نے بھی اندازِ استدلال اختیار کرنے کی کوشش کی لیکن وہ نورِ ہمہ گیری اور برہستگی جو ان کے یہاں موجود ہے کسی سے نہ بن پڑی۔ اس کی ایک وجہ ان لوگوں کی علمی کم مائیگی بھی ہے۔ درہل ان کا طرزِ انشا ان کی ذات ہے صفت نہیں اور وہ اپنے اس رنگ میں مغفوع ہیں اور پھر اعادہ مطالب کے واسطے جس قدر مختلف انداز بیان ان کے یہاں موجود ہیں اردو کے کسی انشا پر دراز کے یہاں شاید ہی موجود ہوں۔ خیالات کی آمد کی یہ حالت ہوتی ہے کہ غنائِ قلم کا کھینچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ترجمان القرآن کے مسودات کی دو تین دفعہ بربادی کے بعد آپ کی طبیعت افسردہ ہو گئی تھی۔ اور پھر رشتہ کار کی یہ گرہ مدتوں کے بعد کھلی تو لکھتے ہیں: یا تو یہ حال تھا کہ بار بار کوشش کی مگر طبیعت کا انقباض دور نہ ہوا۔ یا اب خود بخود کھلی تو اس طرح کہ قلم روکنا بھی چاہتا ہوں تو نہیں رک سکتا ہے

شوریت نوا ریزی تا رنفسم را پیدا نہ اے جنبشِ مضرب کجائی

مولانا کی تحریروں میں بعض اوقات یہ نقص رہا ہے کہ خیالات کی بے پناہ آمد اور تبحرِ علمی کی بدولت بعض اوقات اہل موضوع سے ہٹ کر اس کے دور دراز گوشوں میں چلے جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ باتیں بھی خارج از موضوع نہیں ہوتیں لیکن دور دراز کے گوشوں کی تشریح و اظہار سے اہل مدعا عاجز تو خود حدیثِ مفصل بخواں از پیِ محفل کہہ کر ادا کرنا پڑتا ہے۔ اور پھر ایک اوسط درجے کی قابلیت کے آدمی کے واسطے تسلسل قائم رکھنا بسا اوقات بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ اس قسم کی بے لگام انشا پر ولزی کی بہترین مثال ان کا متذکرہ ہے جسے اپنے جدا مجہد سے شروع کرتے ہوئے امام ابن تیمیہ اور امام احمد بن حنبلؒ تک لے اڑتے ہیں۔ اگرچہ موضوع کا تقاضا یہی تھا لیکن ایک عامی کے واسطے یہ بھول بھلیاں ایک عجیب و غریب

جیزن جاتی ہے اور پھر اس کے ساتھ تذکرے کا انداز بیان قارئین کے ایک مخصوص طبقے ہی سے صحیح معنی میں خراج تحسین حاصل کر سکتے ہیں مگر اب شک ہے کہ یہ قصہ پارینہ ہو چکا ہے۔

ایک اور چیز جو مولانا کی تحریروں پر بعض جگہ ملتی تھی (اب نہیں) وہ یہ تھی کہ وہ الفاظ اور فقرات کی نشست و برخاست کچھ اس طرح کرتے تھے کہ سامع یا قاری کا ذہن و دماغ پرسش کی بجائے پرسش کی طرف مائل ہو جاتا تھا۔ اور اس میں ان کے واعیانہ انداز اور طرز نگارش کو بھی بہت حد تک دخل ہے۔ قاری ان کے الفاظ و فقرات کی دروبست سے مسحور ہو کر دلائل کے استحکام سے بے پروا ہو جاتا ہے۔ ان کی عبارت میں ایک خاص قسم کی تقدیس والوہیت سی جھلکتی ہے۔

مولانا کی زندگی کی بہترین کاوشیں قرآنی آیات کا اردو میں ترجمہ ہے۔ ان کو آیات کا ترجمہ کرنے میں یدِ طولیٰ حاصل ہے، ان کے ترجمے میں عربی متن کی قریب قریب وہی اہمیت و عظمت باقی رہتی ہے۔ ادبی اعتبار سے اس سے بڑھ کر اردو زبان میں کوئی ترجمہ نہیں ہوا۔ ترجمہ میں وہی اسلوب بیان قائم رکھنے کی کوشش کی گئی؟ جو خود قرآن حکیم کا اسلوب بیان ہے اور پھر سورتوں کے اواخر میں بصیرت افروز نوٹ دے ہیں جو مذہبی امور کے علاوہ تاریخی، عمرانی اور سیاسی اُتھیوں کو بڑی خوش اسلوبی سے سلجھاتے ہیں۔

کسی نے سچ کہا ہے کہ مولانا ابوالکلام گریورپ میں ہوتے تو ہندو کم کتنی انجمنیں ان کے نام پر قائم ہوتیں اور کتنے مطالب ان کی تصانیف کی اشاعت کے لئے وقف ہوتے۔ مگر یہاں غلامی نے دوسرے جوہروں کی طرح قدر شناسی کا جوہر بھی کھودیا۔ اردو ادب کے تذکرے اس مایہ ناز ادیب کے ذکر سے خالی نظر آتے ہیں۔ اگر کسی نے ذکر کیا بھی تو ان کے کارناموں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی ہے اور بس۔ افسوس ہے ہمارے نوجوان میکاے، بکین، شیکسپیر اور گین وغیرہم کی تصانیف پر نہایت فخر سے قلم اٹھاتے ہیں لیکن کسی کو یہ یضیب نہیں ہوتا کہ اپنے وطن کے اس قابلِ قدر ادیب کے کارناموں کی طرف توجہ دے۔ جن پر بقول شخصے سینکڑوں، اسپنسر وں اور ہزاروں میکاے بے دریغ نچھاؤ رکھتے جاسکتے ہیں۔